خالد ہمایوں

حضرت داتا گنج بخشؒ اور اُن کی تعلیمات

حضرت داتا گنج بخشؒ کا نام علی اور کنیت ابوالحسن تھی۔ آپ سلطان محمود غزنوی کے دورِ حکومت میں دارالسلطنت غزنی میں ۴۰۰ھ بمطابق ۱۰۰۹ء میں پیدا ہوئے۔ جائے پیدائش غزنی شہر کا محلّہ ہُجویر تھا، اس لیے ہجویری کہلائے۔ آپ جلابی بھی کہلاتے ہیں۔ شہزادہ داراشکوہ لکھتا ہے کہ جلاب اور ہجویر شہر غزنی کے دو محلوں کے نام ہیں کہ آپ ایک محلّہ سے دوسرے محلّہ میں منتقل ہوگئے تھے۔ آپ کا سلسلۂ نسب خلیفۂ راشد حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے جاملتا ہے۔ آپ کا خاندان علم و معرفت اور زہد و تقویٰ میں مشہور تھا۔ غزنی میں ان کی والدہ ماجدہ، ان کے ماموں تاج الاولیا، اور خاندان کے دوسرے بزرگوں کی قبریں موجود تھیں۔ داراشکوہ خود ان مقابر کی زیارت سے مشرف ہوا۔ آپ کے والدِ محترم کا نام سیّد محمد عثمان تھا۔ لقب آپ کا گنج بخش اس وجہ سے ہے کہ حضرت خواجہ مُعین الدین چشتیؒ آپ کے مزار مبارک پر چالیس دن معتکف رہے۔ وہاں سے رخصت ہوتے وقت آپ نے ایک فارسی شعر پڑھا:

گنج بخشِ فیضِ عالم مظہرِ نورِ خدا
ناقصاں را پیر کامل کاملاں را رہنما

ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کہتے ہیں کہ بعض قرائن سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کو آپ کی زندگی ہی میں اس لقب سے ملقب کیا گیا۔

حضرت ہجویری کے حالاتِ زندگی نہیں ملتے، اس لیے تذکرہ نگاروں نے آپ کی

تصنیفِ لطیف کشف المحجوب ہی کو ذریعۂ معلومات بنایا ہے۔ یہی تصنیف بتاتی ہے کہ آپ نے اپنے وقت کے جید علما اور صوفیائے کرام سے اکتسابِ فیض کیا اور اس سلسلے میں طویل سفر بھی کیے۔ آپ عین عالمِ نوجوانی میں سلسلۂ جنیدیہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ ابوالفضل محمد بن الحسن ختلی کے مرید ہو گئے تھے۔ خود ختلی شیخ خصری کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے۔ جن کا سلسلہ طریقت حضرت علیؓ تک اس طرح پہنچتا ہے: ابوبکر شبلی، جنید بغدادی، سری سقطی، معروف کرخی، داؤد طائی، خواجہ حبیب عجمی، خواجہ حسن بصری اور حضرت علیؓ۔ بقول داتا صاحب:

"میرے مرشد تفسیر قرآن اور حدیثِ نبوی کے ایک جید اور متبحر عالم تھے۔ آپ نے ساٹھ برس تک اپنی زندگی گوشہ نشینی میں گزار دی اور وہ زیادہ تر جبل لکام میں رہے۔ ہر چند آپ ایک بلند مرتبت صوفی بزرگ تھے لیکن صوفیائے کرام کا لباس اور اُن کے رسم و رواج کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے تھے:

الدنیا یوم ولنا فیھا صوم.

"یعنی دُنیا ایک روزہ ہے، اور اس دن ہم روزہ سے ہیں۔"

حضرت ہجویری کے مرشد روحانی طور پر کس پائے کے تھے، آپ ہی کے بیان کردہ ایک واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے، لکھتے ہیں:

ایک مرتبہ جب میں اپنے شیخ کے ہاتھ دھلا رہا تھا، تو میرے دل میں یہ خیال آیا کہ جو لوگ آزاد منش ہیں کیا اللہ تعالیٰ انہیں صرف اس لیے بزرگوں اور پیشواؤں کی غلامی میں دیتا ہے کہ وہ اُن کی کرامات سے فائدہ اُٹھائیں۔ حالانکہ جب تمام امور، تقدیر و قسمت سے وابستہ چلے آتے ہیں تو پھر یہ غلامی کیسی؟ ابھی یہ خیال جو میرے دل میں آیا تھا میں کہنے بھی نہ پایا تھا کہ میرے شیخ نے اپنے کشف سے میرے دل کی بات معلوم کر لی اور فرمایا،

"اے بیٹا جو کچھ تیرے دل میں آیا ہے، مجھے اس کا پتا چل گیا ہے، بات یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو تخت و تاج دینا چاہتا ہے تو اسے توبہ کرنے کی توفیق بھی عطا فرما دیتا ہے اور وہ ایک مہربان دوست کی خدمت کرنے لگتا ہے اور اسی خدمت کے نتیجے میں اس سے کرامت

ظہور پذیر ہوتی ہے۔''

آپ کی علمی اور روحانی تربیت میں جس دوسری شخصیت نے کردار ادا کیا، وہ ابوالعباس شیخ احمد بن محمد الشقانی تھے۔ ان کے بارے میں خود آپ ہی کے کہنے کے مطابق:

''شیخ ابوالعباس علمِ اصول وفروع کے امام تھے اور آپ نے حقیقتِ معانی کو پایا تھا۔ آپ صوفیائے کبار میں سے تھے اور مجھے اُن سے بڑی محبت اور عقیدت تھی اور آپ بھی میرے حال پر بڑی شفقت اور عنایت فرماتے تھے۔ مَیں نے بعض علوم اُن سے حاصل کیے۔''

آپ نے شیخ ابوجعفر محمد الصیدٔ الآری کا بھی ذکر کیا ہے جن سے آپ نے حسین بن منصور کی تصانیف کا درس لیا۔ ان کے علاوہ آپ نے عبدالقاسم، ابوالکریم بن ہوازن القشیری، ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ گورگانی، ابوالعباس احمد بن قصاب، ابوعبداللہ محمد بن علی داغستانی، ابوسعید ابوالخیر اور ابواحمد المظفر بن ہمدانی کا بھی بطور اساتذہ ذکر کیا ہے مگر ان سب سے زیادہ آپ نے شیخ ابوالفضل محمد بن حسن الختلی سے فیض اُٹھایا اور انہی کے دستِ حق پرست پر بیعت کا شرف حاصل کیا۔

آپ فرماتے ہیں کہ جس روز آپ کی وفات ہوئی تو آپ بانیان اور دمشق کے درمیان پہاڑ پر واقع ایک گاؤں بیت الجن میں تھے اور آپ کا سر میری گود میں تھا اور مَیں سخت مضطرب اور مغموم تھا۔ آپ نے میری یہ حالت دیکھ کر فرمایا:

''اے بیٹا! مَیں تجھ سے اعتقاد کا مسئلہ بیان کرتا ہوں۔ اگر تو اپنے آپ کو اسی کے مطابق درست کرلے گا تو سمجھ لے کہ تیرے دل کی تمام تکلیفیں جاتی رہیں گی۔

آپ نے فرمایا:

''اے بیٹا! تیرے لیے لازم ہے تو خدا کے ہر کام کو اس کی رضا پر چھوڑ دے اور جو کچھ وہ کرتا ہے اس پر ہرگز رنجیدہ نہ ہو۔'' ابھی آپ نے اتنی ہی بات فرمائی تھی کہ جان، جانِ آفرین کے سپرد کردی۔

قرونِ وسطیٰ کے صوفیوں کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ [illegible] کا عمل ان کے فکری

اور روحانی ارتقا میں ایک اہم کردار ادا کرتا تھا۔ وہ مختلف اعتقادات رکھنے والے لوگوں سے ملتے اور ان سے مکالمہ کرتے۔ اس وجہ سے ان کے رویوں میں رواداری اور کشادہ قلبی آ جاتی۔ پھر سفر کی صعوبتیں برداشت کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا مجاہدہ ہے جو مشاہدہ کی دولت عطا کرتا ہے۔ روحانی ارتقاع اور فکری پختگی حاصل کرنے کے لیے آپ جن ملکوں اور شہروں میں تشریف لے گئے اور وہاں جن بزرگوں سے کسبِ فیض کیا، اس کا ذکر ''کشف المحجوب'' میں کیا ہے۔ خاص طور سے ماوراء النہر، آذربائیجان، بِسطام، خراسان، کُمِش، کمند، نیشاپور، بخارا، سمرقند، سرخس، طوس، فرغانہ، شلا تک اوزکند، مَرو، ترکستان اور برصغیر پاک و ہند قابلِ ذکر مقامات ہیں۔

حضرت شیخ علی ہجویریؒ نے صرف خراسان میں جن مشائخ سے آپ ملے اُن کی تعداد تین سو ہے، اُن کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مَیں نے خراسان میں تین سو اشخاص ایسے دیکھے ہیں کہ ان میں صرف ایک سارے جہان کے لیے کافی ہے۔ آپ نے اتنے طویل سفروں کے دوران بھی شریعت کی کتنی پاسداری کی، اس بارے میں ڈاکٹر ظہور الدین احمد لکھتے ہیں:

''سیّد ہجویری نے فقیری درویشی اور سفری دشواریوں کے باوجود شرعی احکام کی پابندی میں کوتاہی نہیں ہونے دی۔ بعض صوفیا عشق و معرفت کی بلند منزلوں پر پہنچ کر پاسِ شریعت ضروری نہیں سمجھتے۔ لیکن ان کا عقیدہ ہے کہ صحتِ عقل کے ساتھ شرعی احکام کبھی منسوخ نہیں ہوتے۔ نماز روزہ کو عبادت، ریاضت اور متصوفانہ مجاہدات کا جزو ہی سمجھا جاتا ہے۔ اُنہوں نے نماز کے بیان میں ایک درویش کے متعلق لکھا ہے کہ وہ چالیس سال سفر میں رہے اور انہوں نے کبھی نماز باجماعت قضا ترک نہیں کی۔ ہر قصبہ میں ٹھہر کر نماز جمعہ بھی ادا کی۔ بزمِ صوفیا کے مؤلف کا خیال ہے کہ اس بیان میں داتا صاحب نے اپنے متعلق اشارہ کیا ہے۔''

ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مجھے بعض مشکل مسائل کا سامنا تھا۔ مَیں نے بڑی کوشش کی مگر میری قلبی مشکلات حل نہ ہوسکیں۔ مَیں حضرت بایزید بسطامی کے مزار پر تین ماہ ٹھہرا رہا مگر مسائل اور مشکلات جوں کی توں رہیں۔ آخر میں نے خراسان جانے کا ارادہ کیا اور

''پترکش'' کے ایک قریبی گاؤں میں رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس گاؤں میں کسی ولی اللہ کا مزار تھا۔ اس خانقاہ پر کئی گدڑی پوش صوفیائے کرام قیام پذیر تھے۔ مَیں نے اس دن ایک کھردری گدڑی پہنی ہوئی تھی۔ میرے پاس کوئی سامان نہیں تھا، صرف ایک کوزہ اور ایک ڈنڈا تھا۔

ان صوفیوں نے مجھے اس لباس میں دیکھا تو حقارت سے نظر انداز کر دیا اور کہنے لگے تم ہم میں سے نہیں ہو۔ مَیں واقعی ان میں سے نہیں تھا۔ رات کا ایک حصہ گزرا تو مجھے کہنے لگے تم اس اونچی جگہ لیٹ رہو۔ وہ خود ایک چبوترے پر جا بیٹھے۔ اُنہوں نے مجھے ایک باسی اور بدبودار سوکھی روٹی دی اور خود اعلیٰ قسم کے کھانے کھانے لگے۔ مجھے ان کے کھانوں کی خوشبو آ رہی تھی اور ان کے چٹخاروں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ کھانے کھاتے رہے اور مجھے پر طنز بھی کرتے جاتے۔ کھانا کھانے کے بعد وہ خربوزے کھانے لگے اور خربوزوں کے چھلکے مجھ پر پھینکتے جاتے اور قہقہے لگاتے جاتے۔ مَیں نے دل میں کہا اے اللہ! اگر یہ لوگ تیرے نیک بندوں کے لباس میں نہ ہوتے تو مَیں اُن کی وہ خبر لیتا کہ وہ یاد رکھتے۔ اس کے باوجود ان کی زبانیں طنز کرنے اور ہاتھ چھلکے پھینکنے سے نہ رُکے۔ مَیں اُن کی یہ حرکات برداشت کرتا رہا، اپنے نفس کی انا کو دباتا رہا۔ ان کی ملامت پر ضبط کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے اس برداشت کی وجہ سے میری قلبی مشکلات آسان فرما دیں اور میرے مسائل حل ہو گئے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اولیاء اللہ بعض مجہول اور جاہل قسم کے لوگوں کو اپنے ساتھ کیوں رکھتے ہیں۔

ایک واقعہ عراق سے متعلق بیان کرتے ہیں کہ عراق میں اپنے قیام کے زمانے میں ایک دفعہ میں دُنیا کمانے اور اسے خرچ کرنے میں بہت دلیر ہو گیا۔ جس کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی وہ میری طرف رجوع کرتا اور مَیں نہ چاہتا کہ میرے دروازے سے کوئی خالی جائے، اس لیے اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ مَیں بہت زیادہ مقروض ہو گیا۔ پریشانی بڑھ گئی تو ایک بزرگ نے مجھے لکھا: ''بیٹا! دیکھو، اس قسم کی مشغولیت میں کہیں خدا سے دُور نہ ہو جاؤ۔ یہ مشغولیت ہوائے نفس ہے۔ اگر کسی کے دل کو اپنے سے بہتر پاؤ تو اس کی خاطر

پریشانی اُٹھاؤ۔ تمام مخلوق کے کفیل بننے کی کوشش نہ کرو کیونکہ اپنے بندوں کے لیے خدا خود کافی ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس نصیحت سے مجھے سکونِ قلب حاصل ہوا اور مَیں نے یہ جانا کہ مخلوقات سے دُور رہنا صحت وسلامتی کی راہ ہے۔

عالمِ اسلام کی طویل سیر و سیاحت کے بعد آخر میں آپ لاہور تشریف لائے اور تادمِ آخر اسی شہر میں سکونت اختیار کیے رکھی۔ آپ کی لاہور آمد کب ہوئی، اس بارے میں مختلف روایات بیان ہوئی ہیں۔ قاضی جاوید صاحب نے حفیظ ملک کی وساطت سے لکھا ہے کہ ''عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ آپ ۱۰۳۹ء میں سلطان محمود غزنوی کے بیٹے اور جانشین سلطان مسعود کے ساتھ لاہور آئے تھے''

''فوائد الفواد'' کے حوالے سے ایک روایت بہت مشہور ہے کہ شیخ علی ھجویری اور شیخ حسین زنجانی ایک ہی مرشد کے مرید تھے۔ جب مرشد نے ہجویری سے کہا کہ لاہور جاؤ تو انہوں نے کہا وہاں زنجانی موجود ہیں۔ انہوں نے پھر ارشاد فرمایا کہ تم جاؤ۔ چنانچہ جس رات وہ لاہور پہنچے، اسی رات حسین زنجانی کا انتقال ہوا۔ محققین نے اس روایت کو غلط ثابت کیا ہے۔ کیونکہ داتا صاحب کے معاصرین میں شیخ حسین زنجانی نام کے کوئی بزرگ نہیں گزرے۔ البتہ اس نام کے بزرگ کا مقبرہ لاہور کے محلّہ مصری شاہ میں واقع ہے۔ آئینِ اکبری کے مطابق ان کی وفات کا سن ۶۰۰ھ ہے۔

جن ایام میں حضرت علی ھجویریؒ لاہور پہنچے، تب ہند کی سرزمین غزنوی لشکر کافی روند چکے تھے۔ مقامی راجپوت طاقتیں زبردست شکستوں کے زخم چاٹ رہی تھیں۔ برہمن طبقہ کا غرور بھی خاک میں مل چکا تھا۔ البتہ مجموعی طور پر غیر مسلم عوام کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف غم وغصہ موجود تھا۔ ان حالات میں کسی مسلم شخصیت کا باہر سے آکر پنجاب میں صدائے حق بلند کرنا اور ان کے دلوں اور دماغوں کو تسخیر کرنا کارِ دارد تھا۔ حضرت داتا صاحب سے پہلے شیخ اسماعیل بخاری نورِ اسلام کو پھیلانے میں ایک کردار ادا کر چکے تھے۔ ایک روایت کے مطابق اُنہوں نے لاہور میں قیام کے دوران سینکڑوں ہندوؤں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ ایک دوسری

روایت کے مطابق ۳۹۶ھ میں آپ نے لاہور میں پہلا وعظ کیا تھا۔

اب داتا صاحب تشریف لائے تو وہ اسی صورت میں کامیاب ہو سکتے تھے اگر وہ غیر معمولی حد تک روحانی اور اخلاقی طاقت سے مالامال ہوں۔ چنانچہ داتا صاحب طویل روحانی تربیتی مراحل سے گزرنے کے بعد اس مقام پر یقیناً فائز ہو چکے تھے جہاں ان کی آواز میں بلا کا اعتماد اور کردار میں پہاڑ کی سی صلابت پیدا ہو گئی تھی۔ ان ایام سے متعلق جو چند حکایات عوامی سطح پر سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی ہوئی ہم تک پہنچی ہیں، ان کی سند جیسی بھی ہو وہ اس بات کی گواہی تو دیتی ہیں کہ مقامی غیر مسلم سادھو فقیر طبقہ نے آپ کی زبردست روحانی طاقت کو بہت جلد تسلیم کر لیا، بلکہ وہ آپ سے روحانی فیض حاصل کرنے کے لیے آپ کے آستانے پر بھی آنے لگا۔

ہندوستان کی ثقافتی، مذہبی اور فکری تاریخ پر عمیق نگاہ ڈالیں تو اندازہ ہوگا کہ تفکر اس زمین کے خمیر میں شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اپنشدوں سے لے کر جین مت کے قائد مہاویر سوامی اور بدھ مت کے بانی مہاتما بدھ کی تعلیمات تک، ہر دور میں نجات کا مسئلہ رشیوں مُنیوں کی فکر کا مرکزی نکتہ رہا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ نے جب اس سرزمین پر قدم رکھا تو وہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے ساتھ ساتھ فکر و فلسفہ سے بھی آگہی رکھتے تھے۔ چنانچہ ہر حلقۂ زندگی سے سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا۔ ایک اہم واقعہ لاہور کے نائب حاکم رائے راجو کے قبولِ اسلام کا ہے۔

حضرت موسیٰ امرتسریؒ رقم طراز ہیں کہ ”داتا صاحب نے پاک و ہند کے اکثر شہروں کی سیاحت کی تھی، یہاں کے علما سے ملے تھے اور یہاں کی تہذیب و تمدن، رسم و رواج اور ہندوؤں کے عقائد سے گہری واقفیت حاصل کی تھی۔“ کشف المحجوب میں حضرت ابوحلیم حبیب بن اسلم راعیؒ کے حالات میں لکھتے ہیں:

”شیخؒ کی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے ان کو چھوڑتا ہوں اور مجھے یہ سخت دِقّت پیش آ رہی ہے کہ میری کتابیں غزنی میں ہیں اور مَیں ملک ہندوستان کے ایک گاؤں بھنور میں ہوں جو کہ ملتان کے گرد و نواح میں واقع ہے اور بالکل غیر جنسوں میں

گرفتار ہوں۔

آپ نے ہندوستان میں بھی دور دراز سفر کیے لیکن مقام اور مرکز مستقل طور پر لاہور ہی رہا۔ آخر اسی شہر میں ۴۶۵ھ میں انتقال فرمایا اور یہیں دفن ہوئے۔

حضرت داتا صاحب فقہ حنفی کے پیروکار تھے۔ حضرت امام حنیفہؒ سے گہری عقیدت رکھتے تھے۔ اس سلسلے میں اپنا ایک ایمان افروز خواب بھی کشف المحجوب میں رقم فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں:

''مَیں ایک بار ملکِ شام میں تھا اور حضرت بلالؓ کے مزار کے سرہانے سو رہا تھا کہ اپنے کو مکہ معظمہ میں دیکھا اور اسی خواب میں دیکھا کہ سرکارِ مدینہؐ باب بنی شیبہ سے تشریف لا رہے ہیں اور ایک بزرگ معمر کو اپنے پہلو میں اس طرح لے رکھا ہے جیسے بچوں کو شفقت سے لیتے ہیں۔ مَیں فرطِ محبت سے دوڑا اور حضورؐ کے پائے اقدس کو چومنے لگا اور مَیں اس تعجب میں تھا کہ یہ معمر حضور کے اتنے محبوب کون ہیں؟ حضورؐ میرے تعجب کو نورِ نبوت سے سمجھ گئے۔ مجھے فرمانے لگے، یہ تیرا امام ہے اور تیرے شہر کے لوگوں کا امام ہے۔''

آپ کی ازدواجی زندگی کے بارے میں وضاحت نہیں ملتی۔ کشف المحجوب ہی کے مندرجات سے علماء نے جو نتائج اخذ کیے ہیں ان کے مطابق حضرت نے ایک شادی کی تھی۔ اہلیہ کی وفات کے ۱۱ سال بعد ایک ایسی عورت کی خوبیوں پر فریفتہ ہو گئے جسے انھوں نے دیکھا تک نہ تھا اور ایک سال تک اس کے عشق میں مبتلا رہے، بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے دل سے اس عورت کا خیال محو فرمایا۔

آپ کی تصنیف کردہ کتابوں کی تعداد نو بتائی جاتی ہے لیکن ان میں سے صرف کشف المحجوب ہی محفوظ رہ سکی۔ شعر و شاعری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی اور آپ کا دیوان بھی تھا۔ کشف المحجوب ہی میں اس کا ذکر کیا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی تصانیف کو اپنے نام سے منسوب کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے میرے شعروں کا دیوان دیکھنے کے لیے مانگا اور پھر واپس نہ کیا اور اس کے شروع سے میرا نام محو کر کے اسے اپنے نام سے پیش کر دیا۔

چونکہ دیوان کا یہی ایک نسخہ تھا جو وہ لے گیا، اس لیے مَیں کچھ نہ کر سکا اور اس نے میری محنت برباد کردی۔ اس تلخ تجربے کے بعد داتا صاحب نے کشف المحجوب میں کئی مقامات پر اپنا نام درج کیا ہے تاکہ یہ کتاب سرقے سے محفوظ ہو جائے۔

کشف المحجوب کا اسلامی تصوف کی بلند پایہ کتابوں میں شمار ہوتا ہے۔ فارسی زبان میں یہ پہلی تصوف کی کتاب ہے۔ اس میں راہِ سلوک کی اتنی تفاصیل آ گئی ہیں اور اندازِ بیان اتنا شستہ ہے کہ اس کے بارے میں حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا کہ جسے کوئی مرشد میسر نہ آ رہا ہو وہ اسے اپنا مرشد بنا لے۔ حضرت شیخ ہجویریؒ نے خود وضاحت فرمائی ہے کہ آپ نے ابوسعید غزنوی کی درخواست پر یہ کتاب مرتب کی ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ اس طرح بیان کی ہے کہ دُنیا میں حقیقت چھپی ہوئی ہے، یہ کتاب اس حقیقت کا انکشاف کرتی ہے۔ حجاب دو قسم کے ہوتے ہیں: ایک رینی، دوسرا غینی۔ رینی یہ ہے کہ انکار و سرکشی کے ارتکاب سے روح مسخ ہو چکی ہو اور اس کی اصلاح ممکن نہ ہو۔ غینی سے مراد ہے کہ روح ایسے مسخ ہو چکی ہو جیسے آئینے پر زنگ آ جائے جسے صیقل کرنا ممکن ہو۔ یہ کتاب انہی لوگوں کے لیے مفید ہے۔

کتاب میں تصوف، صوفی، صوفیا کے مختلف فرقوں کا بیان مثلاً محاسبہ، قصاریہ، طیفوریہ، جنیدیہ، نوریہ، حلکمیہ، خوازیہ، خفیفیہ، سیاریہ، حلولیہ، پھر ان کے مختلف معتقدات کا بیان اور بعض بڑے دقیق مضامین پر مباحث ہیں۔ اس کے علاوہ رضا، مقام و حال، سکر و صحو، فنا و بقا، غیب و حضور، جمع و تفرقہ، ولایت و کرامت۔ اس کے بعد گیارہ حجابات کا کشف۔ حجابات، معرفتِ الٰہی، توحید، ایمان، طہارت، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، آداب صحبت اور سماع کے بارے میں۔ اصطلاحات میں قبض و بسط، نفی و اثبات، علم و معرفت، شریعت و حقیقت اور مکاشفہ و محاضرہ کی وضاحت کی گئی ہے۔

ہر عنوان پر بحث کی ترتیب اس طرح قائم کرتے ہیں کہ پہلے قرآن مجید کی آیات، پھر احادیث اور پھر صوفیا کے اقوال لاتے ہیں۔ جابجا عربی اشعار سے بھی کام لیتے ہیں۔ بعض مقامات پر فلسفیانہ پیچیدگیاں زیر بحث آتی ہیں۔ جہاں حضرت ہجویریؒ کی بلا کی علمیت کا ثبوت

ملتا ہے۔ آپ کے دَور تک تصوف پر فلسفے کے اثرات بہت بڑھ چکے تھے۔ خاص طور سے حسین بن منصور حلاج کے خیالات نے تصوف کو الٰہیاتی حوالے سے گورکھ دھندا بنا کر رکھ دیا تھا۔ شریعت اور طریقت میں فاصلے بڑھ گئے تھے۔ داتا صاحب نے روحانی ارتقا کے لیے ان دونوں کو ناگزیر قرار دیا۔ وجودی نظریات کی وجہ سے خالق اور مخلوق کے درمیان فرق ختم ہو رہا تھا۔ داتا صاحب نے فرمایا: ''قدیم اور محدث، خالق اور مخلوق، صانع اور مصنوع کا امتزاج نہیں ہوسکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ انسان کا وجود فنا ہو کر خدا کے وجود میں حلول کر جائے۔ کسی شخص کو خدا اور اس کی صفات کے ساتھ مشارکت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا عقیدہ رکھنا صریح کفر اور دہریوں کا مذہب ہے۔

حضرت داتا صاحب نے اپنے عہد پر بھی اور بعد کے زمانوں پر بھی بہت اثرات مرتب کیے۔ خاص طور سے جلال الدین اکبر کے دینِ الٰہی کا فتنہ اُٹھا اور ولایت کو نبوت پر ترجیح دینے کا نظریہ سر اُٹھانے لگا تو یہ آپ کی تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ علماء اور صلحا کا ایک گروہ اس کا ردّ کرنے کے لیے سرگرمِ عمل ہو گیا۔ آج جب ہم اپنے گرد و پیش پر نگاہ دوڑاتے ہیں تو یوں لگتا ہے جیسے تہذیبی پراگندگی نے اب ہمیں اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ وہ اس تہذیبی پراگندگی سے کچھ بھی مختلف نہیں جس کا ذکر حضرت داتا صاحب نے اپنی تصنیف میں کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں:

''خداوند بزرگ و بلند نے ہمیں اس زمانے میں پیدا کیا ہے جب لوگوں نے حرص و لالچ کا نام شریعت اور تکبر و جاہ و ریاست کی طلب کا نام عزت اور علم، ریائے خلق کا نام خوفِ الٰہی اور دل میں کینہ پوشیدہ رکھنے کا نام حلم، لڑائی جھگڑے کا نام بحث و مباحثہ، ہذیانِ طبع کا نام معرفت، نفسانی باتوں اور دل کی حرکتوں کا نام محبت۔ خدا کے رستے سے منحرف اور بے دین ہونے کا نام فقر۔ حق تعالیٰ اور آخرت پر ایمان نہ رکھنے کا نام فنا فی اللہ اور ترکِ شریعت کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔

آیئے ہم اپنے اس عظیم صوفی بزرگ کی تعلیمات پر غور کریں اور ان کی روشنی میں اپنے احوالِ زندگی سنوارنے کی کوشش کریں۔